رسائل و مسائل

صحابہ کرام بعض اختلافات کے باوجود رُحَمَآءُ بَیْنَہُمْ تھے

سوال۔ مجھے چند روز قبل فضائلِ صحابہ کے موضوع پر اظہارِ خیال کا موقع ملا۔ میں نے حسبِ توفیق مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَہُمْ کی تشریح کی۔ بعد میں ایک صاحب نے سوال کیا کہ قرآن شریف تو صحابہؓ کی یہ صفت بیان کر رہا ہے لیکن واقعات کی تصویر اس کے برعکس ہے۔ جنگِ جمل و صفین میں دونوں طرف اکابر صحابہ موجود تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ بھی ایک فریق کے ہمراہ تھیں۔ ان واقعات کی روشنی میں رُحَمَآءُ بَیْنَہُمْ کی صحیح توجیہ کیا ہو سکتی ہے؟ میں نے حتی الوسع اس معاملے پر غور کیا، بعض کتبِ دینیہ اور ذی علم احباب سے بھی رجوع کیا مگر کوئی اطمینان نہ ہو سکا۔ آپ براہِ کرم ان واقعات کو نگاہ میں رکھتے ہوئے ارشادِ قرآنی کی صحیح تاویل و توجیہ بیان کریں جس سے یہ اشکال رفع ہو جائے۔

جواب۔ آپ کے عنایت نامے کا جواب افسوس ہے کہ بڑی تاخیر سے دے رہا ہوں۔ اس مہینے شدید مصروفیت رہی اس لیے خطوط پڑھنے تک کا وقت نہ ملا، جواب دینا تو درکنار۔ امید ہے کہ میری مشکلات کو نگاہ میں رکھ کر اس تاخیر سے درگزر فرمائیں گے۔

آیت اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَہُمْ پر جس شبہ کا اظہار محترم سائل نے کیا ہے وہ دو مفروضوں پر مبنی ہے، اور دونوں ہی خلافِ حقیقت ہیں۔ ان کا پہلا مفروضہ یہ ہے کہ کسی شخص یا گروہ کی تعریف میں جب کوئی بات کہی جائے تو لازماً اسے اس معنی میں لینا چاہیے کہ اس شخص یا اس گروہ میں کبھی کوئی جزئی امر بھی اس کے خلاف نہ پایا جائے۔ حالانکہ انسانوں کی تعریف جب بھی کی جاتی ہے ان کے غالب حال کے لحاظ سے کی جاتی ہے، اور کبھی کبھار کوئی چیز اس کے خلاف نظر آئے تو وہ کلی حکم میں قادح نہیں سمجھی جاتی۔ ہم صحابہ کرام

کو دنیا کا سب سے زیادہ اتقیٰ اور اصلح گروہ قرار دیتے ہیں۔ یہ حکم ان کی مجموعی سیرت کے لحاظ سے ہے اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس گروہ میں کبھی بشریت کے تقاضوں سے جزئی کمزوریوں کا سرے سے ظہور ہی نہیں ہوتا تھا۔ آخر اس زمانہ میں بھی کسی کو زنا اور کسی کو چوری کی سزا، اور کسی کو قذف کی سزا تو دی ہی گئی تھی، اور صحابیت کا شرف ان سزا یافتہ لوگوں کو بھی حاصل تھا، کیونکہ ایمان کے بعد جس شخص کو حضور کی صحبت میسر ہوئی ہو وہ بہرحال صحابی ہے، اور ان قصوروں کی بنا پر بہرحال نہ صفت ایمان ان سے سلب ہوئی تھی نہ صفت صحابیت۔ مگر کیا یہ بات کہ کبھی اس معاشرے میں زنا اور چوری اور قذف کے گناہوں کا صدور بھی ہو گیا تھا اس مجموعی حکم میں قادح ہو سکتی ہے کہ وہ معاشرہ صلاح و تقویٰ میں اس بلند ترین مرتبے پر پہنچا ہوا تھا جس پر کبھی کوئی انسانی معاشرہ نہیں پہنچا؟ اسی طرح رحماء بینہم کی صفت صحابۂ کرام کی مجموعی سیرت اور ان کے غالب حال کے لحاظ سے ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ کسی انسانی معاشرے میں آپس کی محبت و الفت باہمی ہمدردی و خیر اندیشی، اور ایک دوسرے کے حقوق کا لحاظ اور مرتبے کا احترام اس درجے کا نہیں پایا جاتا اور نہ پایا گیا ہے جیسا صحابۂ کرام کے معاشرے میں نظر آتا ہے۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ان کے اندر یہ صفت انتہائی ممکن کمال تک پہنچی ہوئی نظر آتی ہے جس کا کسی انسانی معاشرے کے حق میں تصور کیا جا سکتا ہے لیکن انسان جب تک انسان ہیں، ان کے اندر بہرحال کبھی نہ کبھی اختلافات بھی پیدا ہو سکتے ہیں اور وہ اختلافات لڑائی جھگڑے کی صورت بھی اختیار کر سکتے ہیں۔ صحابۂ کرام بھی انسان ہی تھے۔ عالم بالا سے کوئی فوق البشر مخلوق حضور کی صحبت و معیت کے لیے اتر کر نہیں آئی تھی۔ ایک دوسرے کے ساتھ رہن سہن، لین دین، اور اجتماعی زندگی کے معاملات کرتے ہوئے لامحالہ بتقاضائے بشریت ان میں اختلافات بھی ہو جاتے تھے، اور بعض اوقات یہ اختلافات شدید نوعیت بھی اختیار کر گئے ہیں۔ لیکن ان جزئی واقعات سے اس کلی حکم میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا کہ ان کی امتیازی صفت رحماء بینہم تھی، کیونکہ ان کا غالب حال یہی تھا۔

دوسرا مفروضہ جو ان کے اس شبہ کے پیچھے کام کر رہا ہے، یہ ہے کہ صحابۂ کرام میں کبھی جو اختلافات رونما ہوئے ہیں وہ اس نوعیت کے تھے کہ ان سے رحماء بینہم کی صفت بالکل ہی سلب ہو گئی تھی حالانکہ

ان اختلافات کی جو تاریخ ہم تک پہنچی ہے وہ اس بات پر گواہ ہے کہ یہ مقدس انسان جب آپس میں لڑ بھی جاتے تھے تو ان کی اس لڑائی میں بھی رحماء بینہم ہونے کی ایک انوکھی شان پائی جاتی تھی۔ بے شک وہ جنگ جمل و صفین میں ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما ہوئے ہیں، مگر کیا دنیا کی کسی خانہ جنگی میں آپ فریقین کو ایک دوسرے کے ساتھ لڑتے ہوئے بھی ایک دوسرے کا وہ احترام ملحوظ رکھتے دیکھتے ہیں جو ان بزرگوں کی لڑائی میں نظر آتا ہے۔ وہ نیک نیتی کے ساتھ اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتے ہوئے لڑے تھے۔ نفسانی عداوتوں اور اغراض کی خاطر نہیں لڑے تھے۔ انہیں افسوس تھا کہ دوسرا فریق ان کی پوزیشن غلط سمجھ رہا ہے اور خود غلط پوزیشن اختیار کرتے ہوئے بھی اپنی غلطی محسوس نہیں کر رہا ہے۔ وہ ایک دوسرے کو فنا کر دینے پر تلے ہوئے نہیں تھے بلکہ اپنی دانست میں دوسرے فریق کو راستی پر لانا چاہتے تھے۔ ان میں سے کسی نے کسی کے ایمان سے انکار نہیں کیا، اس کے اسلامی حقوق سے انکار نہیں کیا، بلکہ اس کی فضیلت اور اس کی اسلامی خدمات کا انکار بھی نہیں کیا۔ انھوں نے ایک دوسرے کو ذلیل و رسوا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ لڑنے میں انہوں نے لڑائی کا حق ضرور ادا کیا، مگر لڑ کر گرجانے والے کے لیے وہ سراپا رحم و شفقت تھے، اور گرفتار ہو جانے والے پر مقدمہ چلانا اور اس کو سزا دینا یا اس کو ذلیل و خوار کرنا تو درکنار، قید رکھنا اور کسی درجے میں بھی نشانۂ عتاب بنانا تک انہوں نے گوارا نہ کیا۔ ذرا دیکھیے، عین اس موقع پر جبکہ جنگ جمل میں دونوں فوجیں آمنے سامنے کھڑی ہوتی ہیں، حضرت علیؓ حضرت زبیرؓ کو پکارتے ہیں اور وہ ان سے ملنے کے لیے نکل آتے ہیں۔ دونوں میں سے کسی کو بھی دوسرے سے یہ اندیشہ نہیں ہوتا کہ وہ اس پر اچانک حملہ کر دیگا۔ صفوں کے درمیان دونوں ایک دوسرے سے بغلگیر ہو کر روتے ہیں۔ دونوں طرف کی فوجیں یہ دیکھ کر حیران رہ جاتی ہیں کہ یہ ایک دوسرے سے لڑنے آئے تھے اور گلے مل کو رو رہے ہیں۔ دونوں تنہائی میں بات کر کے اپنی اپنی فوجوں کی طرف پلٹ جاتے ہیں۔ حضرت علیؓ کی فوج والے ان سے پوچھتے ہیں کہ امیر المومنین، آپ عین لڑائی کے موقع پر ننگے سر ایک شخص سے تنہا ملنے چلے گئے؟ جواب میں فرماتے ہیں، جانتے ہو وہ شخص کون تھا؟ وہ صفیہ، عمۂ رسول اللہ کا بیٹا تھا۔ میں نے اس کو رسول اللہ کی ایک بات یاد دلائی۔ اس نے کہا کاش یہ بات مجھے پہلے یاد آجاتی تو میں آپ کے مقابلے میں لڑنے نہ آتا۔ لوگ اس پر کہتے ہیں الحمد للہ،

اے امیر المومنین، یہ رسول اللہ کے شہسوار اور حواری ہیں، ہم کو انہی کا سب سے زیادہ خوف تھا۔ دوسری طرف حضرت زبیرؓ پلٹ کر اپنی فوج میں جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ شرف اور اسلام میں جب کبھی میں کسی لڑائی میں شریک ہوا ہوں، مجھے اس میں بصیرت حاصل تھی، مگر اس لڑائی میں نہ میری رائے میرا ساتھ دیتی ہے نہ بصیرت۔ اور یہ کہہ کر وہ فوج سے نکل جاتے ہیں۔ اسی طرح حضرت علیؓ اور حضرت طلحہؓ کی بھی دونوں ہیوں کے درمیان تنہا ملاقات ہوتی ہے، اور دونوں ایک دوسرے کو قائل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لڑائی شروع ہوتی ہے تو حضرت علیؓ اپنی فوج میں اعلان کرتے ہیں کہ خبردار کسی کا تعاقب کرکے نہ مارنا، کسی زخمی پر ہاتھ نہ اٹھانا، ان کے لشکر کا مال تم لے سکتے ہو مگر ان شہداء کے گھروں پر ان کے جو مال ہیں وہ ان کے وارثوں کا حق ہے، اور ان کی عورتوں کے لیے عدّت ہے۔ ایک شخص کہتا ہے کا جب ان کے لشکر کے مال ہمارے لیے حلال ہیں تو ان کی عورتیں کیوں نہ حلال ہوں؟ حضرت علیؓ بگڑ کر فرماتے ہیں کہ تم میں سے کون اپنی ماں عائشہ کو اپنے حصے میں لینے کے لیے تیار ہے؟ لوگ پکار اٹھتے ہیں استغفر اللہ۔ جنگ کے بعد مقتولوں پر سے حضرت علیؓ کا گزر ہوتا ہے۔ حضرت طلحہؓ کے بیٹے محمد کی لاش پر نظر پڑتی ہے بے اختیار فرماتے ہیں: رحمک اللہ یا محمد۔ لقد کنت فی العبادۃ مجتھدا ناء اللیل قواما و فی الحر صواما۔ "خدا کی رحمت ہو تم پر اے محمد تم بڑے عبادت گزار، راتوں کو کھڑے رہنے والے اور سخت گرمیوں میں روزے رکھنے والے تھے۔" حضرت زبیرؓ کا قاتل انعام کی امید پر حاضر ہوتا ہے تو اس کو دوزخ کی بشارت دیتے ہیں۔ حضرت عائشہؓ کے ہودے کے پاس پہنچتے ہیں تو اس سے زیادہ کچھ نہیں کہتے کہ "اے ہودے والی، اللہ نے آپ کو گھر میں بیٹھنے کا حکم دیا تھا اور آپ لڑنے نکل آئیں"۔ پھر بڑے احترام کے ساتھ ان کو مدینہ روانہ کر دیتے ہیں، اور وہ اس حسن سلوک پر ان کو دعا دیتی ہیں کہ جزی اللہ ابن ابی طالب الجنۃ۔ حضرت طلحہؓ کے بیٹے موسیٰ حضرت علیؓ سے ملنے آتے ہیں تو آپ انھیں بٹھا کر فرماتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ میں اور تمھارے باپ اُن لوگوں میں سے ہونگے جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ "ہم ان کے دلوں سے باہمی کدورت نکال دیں گے اور وہ جنت میں بھائی بھائی کی حیثیت سے آمنے سامنے چھپر کھٹوں پر بیٹھے ہونگے"۔ ایک شخص پوچھتا ہے آپ کے پاس یہ کون آیا تھا۔ فرماتے ہیں یہ میرا بھتیجا تھا۔ وہ عرض کرتا ہے کہ اگر یہ

آپ کا اب بھی بھتیجا ہے تو ہم تو پھر بد بخت ہی ہوئے۔ اس پر ناراض ہو کر حضرت علیؓ فرماتے ہیں ویحک ان اللہ قد اطلع علیٰ اھل بدر فقال اعملوا ما شئتم فقد غفرت لکم۔ دیکھیے، یہ شان تھی ان لوگوں کی آپس کی لڑائی کی۔ وہ تلوار بھی ایک دوسرے پر اٹھا کر رُحَمَاءُ بَیْنَھُمْ ہی رہتے تھے۔ ان کے دلوں میں ایک دوسرے کی قدر، عزت، محبت، اسلامی حقوق کی مراعات، اس شدید خانہ جنگی کی حالت میں بھی جوں کی توں برقرار رہی۔ اس میں یک سرِ مُو فرق نہ آیا۔ بعد کے لوگ جس کے حامی بن کر ان میں سے کسی کو گالیاں دیں تو یہ ان کی اپنی بدتمیزی ہے، مگر وہ لوگ آپس کی عداوت میں نہیں لڑے تھے اور لڑ کر بھی ایک دوسرے کے دشمن نہ ہوئے تھے۔

کیا مشرکین کے بچے جنت میں جائیں گے؟

سوال:۔ میں ایک ۱۸ سالہ سندھی نوجوان ہوں۔ اس وقت میٹرک میں ہوتے ہوئے ایک عربی مدرسہ میں دو سال سے دینی تعلیم بھی حاصل کر رہا ہوں۔ ہمارے ہاں عربی تعلیم کا نظام کچھ اس طرز کا ہے کہ ابتدا ہی میں میرے اندر اس تعلیم سے نفرت اور بیزاری پیدا ہو گئی اور ایک سال کے اندر اندر اسی عربی تعلیم نے مجھے "لامذہب" بنا کے رکھ دیا۔ لیکن چونکہ میرے اندر صراطِ مستقیم پانے کی دلی تمنا تھی اس لیے میں ہمیشہ بارگاہِ الٰہی کے حضور میں دعا کرتا رہا کہ وہ مجھے "راہِ راست" پر لے آئے۔ اللہ تعالیٰ نے انتہائی کرم فرمائی کی کہ مجھے ایمان ایسی دولت پھر سے عطا ہوئی چنانچہ میں اب اُسی کے فضل و کرم سے دل و جان سے مسلمان ہوں، قومیت سے سخت متنفر اور نظریۂ انسانیت کا پیرو۔ اس ایک سال کے عرصہ میں میں نے "مسند و منبر" دونوں کو دیکھا لیکن کہیں سے اطمینانِ قلبی نصیب نہیں ہوا۔ اور اگر کہیں سے یہ نعمت میسر آئی تو پھر اُسی کتابِ الٰہی کے مطالعہ سے جسے لوگ قرآنِ حکیم کہتے ہیں۔

یوں تو اب میں اسلام کو اپنا دین مان چکا ہوں لیکن پھر بھی مطالعہ کے دوران میں بعض اعتقادی اور فقہی مسائل ایسے آتے ہیں جو بسا اوقات مجھے پریشان کرتے ہیں۔ آج ہی کی بات ہے کہ مدرسہ

میں مشکوٰۃ کا درس ہو رہا تھا جب اس حدیث پر پہنچا جو باب الایمان بالقدر میں ہے کہ عن ابن مسعود قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الوائدۃ والمودۃ فی النار (لڑکی کو زندہ گاڑنے والی اور وہ لڑکی جو زندہ گاڑی گئی، دونوں جہنم میں جائیں گی)۔ تو میں نے استادِ مکرم سے صرف یہ کہا کہ حضور یہ حدیث میری سمجھ میں نہیں آئی۔ انھوں نے جواب دیا کہ تمہاری سمجھ ہے ہی کیا کہ تم اسے سمجھ سکو، تمہیں تو بس آمنا وصدقنا ہی کہنا چاہیے۔ میں نے عرض کیا کہ یہ صحیح ہے کہ میری سمجھ ناقص ہے لیکن میں اتنا تو سمجھ سکتا ہوں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دہن مبارک سے ایسے ناانصافی کے الفاظ نہیں نکل سکتے۔ اگر آپ نے یہ حدیث فرمائی ہے تو اس کا مفہوم یہ نہیں ہو سکتا جو بظاہر ترجمہ سے معلوم ہوتا ہے، اور اگر اس کا مفہوم یہی ہے تو پھر یہ حدیث حضور سرورِ کائنات کی نہیں ہو سکتی۔ میرے یہ الفاظ کہنے تھے کہ میرے لیے مصیبت پیدا ہو گئی۔ مجھے محض اس وجہ سے مدرسہ سے خارج کر دیا گیا اور کہا گیا کہ تم منکرِ حدیث ہو۔ حالانکہ میں منکرینِ حدیث کے مسلک کو صحیح نہیں سمجھتا، اور اُسے گمراہ کُن خیال کرتا ہوں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ہمیں احادیث کو سمجھنے کا حق بھی پہنچتا ہے یا نہیں۔ ہم بلا سوچے سمجھے کس طرح اس قسم کی احادیث پر آمنا وصدقنا کہنا شروع کر دیں حالانکہ بعض محدثین نے اس کی اسناد کو بھی ضعیف قرار دیا ہے۔ براہِ کرم اس حدیث کی وضاحت فرما کر میری رہنمائی فرمائیں۔

جواب: یہ معلوم کر کے بڑا افسوس ہوا کہ آپ کو صرف اس قصور پر مدرسے سے نکال دیا گیا کہ درسِ حدیث کے دوران میں ایک حدیث کے مضمون پر آپ کو شک لاحق ہوا تھا اور پڑھانے والے مولوی صاحب آپ کا شک رفع کرنے سے عاجز تھے۔ قصور تو اصل میں اُن مولوی صاحب کا تھا جو اُس چیز کی تعلیم دینے بیٹھ گئے تھے جس کی مشکلات کو حل کرنے کی قابلیت ان میں نہ تھی۔ لیکن افسوس کہ اس کی سزا آپ کو دے دی گئی۔ ایسی ہی حرکات سے ہمارے ہاں کے بعض علمائے کرام اچھے خاصے صحیح الفکر اور سلیم الطبع لوگوں کو گمراہیوں کی طرف دھکیل دیتے ہیں۔

آپ کو جس حدیث کے مضمون نے پریشانی میں ڈالا ہے وہ دراصل ایک بڑے مسئلے کے فروع میں سے ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ بچے جو سن رشد کو پہنچنے اور کسی مذہبِ حق یا مذہبِ باطل کو بالارادہ اختیار کرنے سے پہلے ہی مر گئے ہوں اُن کا انجام کیا ہو گا۔ اس مسئلے پر روشنی ڈالنے والی بہت سی احادیث پائی جاتی ہیں، مگر ان میں بڑا

اختلاف ہے۔ بعض حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سب جنت میں جائیں گے۔ بعض کہتی ہیں کہ کفار و مشرکین کے بچے دوزخ میں اور اہلِ ایمان کے بچے جنت میں جائیں گے۔ اور بعض سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے معاملے کا فیصلہ اپنے اس علم کے لحاظ سے کرے گا کہ وہ کیا کرنے والے تھے، یعنی جوان ہو کر وہ مومن صالح بنتے یا کچھ اور۔ انہی مختلف المعنی احادیث میں سے ایک وہ حدیث بھی ہے جس کا آپ نے ذکر کیا ہے۔ وہ اُن احادیث کے سلسلے میں آتی ہے جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ کفار و مشرکین کے بچے جہنم میں جائیں گے، یا بالفاظِ دیگر بچوں کے ساتھ آخرت میں وہی معاملہ کیا جائے گا جس کے مستحق ان کے والدین ہونگے۔

جب احادیث میں اس طرح کا کھلا کھلا اختلاف واقع ہو جائے، اور ان کو جمع کر کے کوئی ایسا مفہوم تلاش کرنا مشکل ہو جس میں سب کے درمیان مطابقت پیدا ہو سکے، تو پھر یہ دیکھنا ضروری ہو جاتا ہے کہ ان میں سے کون سند کے لحاظ سے زیادہ قوی اور معنی کے لحاظ سے قرآن اور دین کے اصولِ عامہ کے مطابق ہیں۔ جو احادیث ایسی ہوں ان کو دوسری تمام احادیث پر ترجیح دی جائے گی اور انہی کو قبول کیا جائے گا۔

علمائے محققین نے اس قاعدے کے مطابق ان مختلف احادیث کی جانچ کر مسئلہ زیر بحث میں جس چیز کو مذہب صحیح قرار دیا ہے وہ یہ ہے کہ ایسے تمام بچے جنت میں جائیں گے، کیونکہ اسی مضمون کی احادیث زیادہ قوی ہیں، قرآن کے مطابق ہیں، اور دین کے اصولِ عامہ بھی انہی کی تائید کرتے ہیں۔ چنانچہ امام نووی شرح مسلم میں اس مسئلے پر کلام کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"رہے مشرکین کے بچے تو ان کے بارے میں تین مذہب ہیں۔ اکثر لوگ کہتے ہیں کہ وہ اپنے آباء و اجداد کے ساتھ جہنم میں جائیں گے۔ ایک گروہ ان کے معاملہ میں توقف کرتا ہے۔ اور تیسرا مذہب یہ ہے کہ وہ اہلِ جنت میں سے ہیں۔ یہی مذہب صحیح ہے، اسی کو محققین نے اختیار کیا ہے، اور اس کی تائید بہت سی چیزوں سے ہوتی ہے۔ مثلاً بخاری کی وہ حدیث جس میں بیان ہوا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں حضرت ابراہیمؑ کو بہشت میں دیکھا اور ان کے ارد گرد لوگوں کے بچے تھے، صحابہ کرام نے پوچھا کیا ان میں مشرکین کے بچے بھی تھے، حضورؐ نے فرمایا ہاں مشرکین کے بچے بھی تھے۔ اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُولًا "ہم عذاب دینے والے نہیں ہیں جب تک کہ کوئی رسول نہ بھیج دیں"۔ اور یہ بات متفق علیہ ہے کہ بچے پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے

لعنہ رسول کا قول اس پر لازم ہوتا ہے جب تک کہ وہ بالغ نہ ہو جائے۔" (کتاب القدر۔ باب معنی کل مولود یولد علی الفطرۃ)

جہاں تک قرآن مجید کا تعلق ہے وہ اگرچہ اس کی صراحت تو نہیں کرتا کہ غیر مکلف انسان سب کے سب جنت میں جائیں گے، مگر اس معاملہ میں وہ صاف فیصلہ دیتا ہے کہ جہنم میں صرف وہی لوگ جائیں گے جو انبیاء علیہم السلام کی دعوت سے منہ موڑ کر شیطان کا اتباع کریں۔ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ (النساء۔ رکوع ۲۳) لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ أَجْمَعِينَ (ص۔ رکوع ۵) كُلَّمَا أُلْقِيَ فِيهَا فَوْجٌ سَأَلَهُمْ خَزَنَتُهَا أَلَمْ يَأْتِكُمْ نَذِيرٌ قَالُوا بَلَىٰ قَدْ جَاءَنَا نَذِيرٌ فَكَذَّبْنَا (الملک۔ رکوع ۱)، لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (البقرہ۔ رکوع ۴۰)۔ یہ اور بہت سی دوسری آیات اس معاملہ میں بالکل صاف ہیں۔

اب رہ گئیں احادیث، تو ان میں بکثرت ایسی صحیح روایات موجود ہیں جو یا تو اس کی صراحت کرتی ہیں کہ بچے جنت میں جائیں گے، یا اس پر دلالت کرتی ہیں کہ وہ عذاب آخرت سے محفوظ رہیں گے۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور وہ روایت ہے جو صحیحین میں کئی طریقوں سے آئی ہے کہ

ما من مولود الا یولد علی الفطرۃ فابواہ یھودانہ وینصرانہ ویمجسانہ کما تنتج البھیمۃ جمعاء ھل تحسون فیھا من جدعاء

کوئی بچہ ایسا نہیں ہے جو فطرت پر پیدا نہ ہوتا ہو۔ بعد میں اس کے والدین اسے یہودی، نصرانی، مجوسی بنا لیتے ہیں۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ جانور کے پیٹ سے صحیح و سالم جانور پیدا ہوتا ہے، کیا ان میں سے کسی کو تم کن کٹا پاتے ہو؟ (یعنی ان کے کان تو بعد میں جاہل لوگ اپنی رسموں کی وجہ سے کاٹتے ہیں)

اس حدیث میں فطرت پر پیدا ہونے سے مراد فطرت اسلام پر پیدا ہونا ہے، کیونکہ یہودیت، نصرانیت اور مجوسیت کو اس کے بالمقابل بیان کیا گیا ہے۔ نیز اس کی بعض روایتوں میں علی فطرۃ الاسلام و علی ھذہ الملۃ کے الفاظ وارد ہوئے ہیں جو بات کو بالکل واضح کر دیتے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ خود بخود نکلتا ہے کہ بچہ خواہ کافر ماں باپ ہی کا کیوں نہ ہو، اپنے والدین کے مذہب پر نہیں بلکہ اس فطری مذہب پر پیدا ہوتا ہے

جس کے متعلق قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ (الروم۔ رکوع ۴) وہ ماں کے پیٹ سے کفر لے کر نہیں آتا، بلکہ کفر، شرک، دہریت جو کچھ بھی اس کو لاحق ہوتی ہے، بعد میں اپنے ماحول سے لاحق ہوتی ہے۔ اب اگر وہ اُس عمر کو نہ پہنچا ہو جس میں یہ بیرونی اثرات اس پر پڑیں اور وہ ان کو قبول کر کے کافر یا مشرک یا دہریہ بنے، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ خدا کی بنائی ہوئی اس صحیح فطرت پر دنیا سے رخصت ہو گیا جو کفر اور معصیت سے پاک ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ وہ اس دار العذاب میں بھیجا جائے جو صرف کافروں اور فاسقوں ہی کے لیے بنایا گیا ہے۔

اسی مضمون سے ملتی جلتی حدیث وہ ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نقل فرماتے ہیں کہ

انی خلقت عبادی حنفاء کلھم وانھم اتتھم الشیاطین فاجتالتھم عن دینھم (مسلم)

میں نے اپنے سب بندوں کو حنیف پیدا کیا، پھر شیاطین آئے اور انھیں ان کے دین سے ہٹا لے گئے۔

اس حدیث کی بعض روایتوں میں حنفاء مسلمین کے الفاظ ہیں یعنی اللہ نے ان کو مسلم حنیف پیدا فرمایا تھا۔ اس سے بھی یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جو انسان شیطانی گمراہیوں کو اخذ و اختیار کرنے سے پہلے مر جائیں وہ اسی حنیفیت کے عالم میں مرتے ہیں جو ان کا پیدائشی دین ہے، اور ان کے عذاب آخرت میں مبتلا ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔

اس کے بعد وہ احادیث ملاحظہ ہوں جن میں صراحت ہے کہ کافر و مومن سب کے بچے جنت میں جائیں گے۔ اس معنی میں سب سے زیادہ معتبر وہ حدیث ہے جو امام بخاری نے کتاب التعبیر اور کتاب الجنائز میں حضرت سمرہ بن جندب سے نقل کی ہے۔ اس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ ایک روز صبح کی نماز کے بعد حضور نے اپنا ایک طویل خواب سنایا جو آپ نے رات کے وقت دیکھا تھا۔ اس خواب میں حضور کو عذاب اور ثواب کے بہت سے مناظر دکھائے گئے تھے، اور ایک جگہ جنت میں آپ کی ملاقات ایک طویل القامت بزرگ سے ہوئی تھی جن کے گرد و پیش بہت سے بچے (اولاد الناس) تھے۔ سیر کرانے والے فرشتے (جبریل) نے آپ کو بتایا کہ یہ بزرگ ابراہیم علیہ السلام ہیں، واما الولدان الذین حولہ فکل مولود مات علی الفطرۃ "رہے یہ بچے جو ان کے گرد و پیش ہیں، تو ان میں ہر وہ بچہ شامل ہے جو فطرت پر مرا ہے"۔ اس کی تشریح چاہتے ہوئے حاضرین میں

سے ایک صاحب نے سوال کیا واولاد المشرکین؟ "کیا ان میں مشرکین کے بچے بھی شامل تھے؟" حضور نے فرمایا واولاد المشرکین؟ "ہاں مشرکین کے بچے بھی"

اس کی تائید اُس روایت سے بھی ہوتی ہے جو مسند احمد میں خنساء بنت معاویہ بن حَرِیم سے مروی ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ میری پھوپھی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا من فی الجنۃ؟ جنتی کون ہے؟ حضور نے فرمایا النبی فی الجنۃ، والشہید فی الجنۃ والمولود فی الجنۃ "نبی جنتی ہے، شہید جنتی ہے، بچہ جنتی ہے"

بعض علماء نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ قرآن مجید میں جن کو غلمان اور وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ (ہمیشہ حالت طفلی ہی میں رہنے والے لڑکے) کہا گیا ہے وہ یہی بچے ہونگے۔ یہ بات بہت قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے اور بعید نہیں کہ اس کی صورت یہ ہو کہ جن بچوں کے والدین جنتی نہ ہوں وہ اہلِ جنت کے دائمی و ابدی خادم بنا دیئے جائیں، واللہ اعلم بالصواب۔

اس بات کو اصل قرار دینے کے بعد دوسری تمام احادیث کی یا تو اس کے مطابق تاویل کی جائے گی، یا پھر اُن کے بارے میں توقف کیا جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی جگہ صحیح ہوں مگر ان کے کوئی ایسے معنی ہوں جو روایت کردہ الفاظ سے پوری طرح ظاہر نہ ہو رہے ہوں۔